قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔ قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو ان آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب وغریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور وفکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالے سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدارس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔

۴

ہم کیوں پیچھے رہ گئے؟

مسلمان جو خیر امت کے دعویدار ہیں اور جنہیں آخری رسولؐ کے متبعین کی حیثیت سے بجا طور پر سیادت عالم کے منصب پر فائز ہونا چاہئے تھا وہ صدیوں سے خود کو ایک چبھتے سوال کے زد میں پاتے ہیں۔ اگر واقعی وہ خیر امت ہیں اور اگر اہل ایمان کے لئے دنیا و آخرت دونوں جہان میں کامیابی کے وعدے ہیں تو آخر ایسا کیوں ہے کہ امت مسلمہ کا گراف مسلسل روبہ زوال ہے۔ گیارہ ستمبر اور اس کے بعد کے واقعات نے اس سوال کی دھار کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ ایک ایسی امت جو عددی اعتبار سے دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل ہو، جو جغرافیائی اعتبار سے اسٹراٹیجک علاقوں میں سکونت پذیر ہو اور جس کی سرزمین فطری وسائل سے مالا مال ہو، آخر ایسا کیوں ہے کہ جدید دنیا میں اس کی حیثیت محض صارف کی ہو کر رہ گئی ہے۔ انسانی زندگی میں ٹیکنالوجی کی پیش رفت اور ایجادات و اختراعات سے مستقبل کی زندگی کا جو نیا نقشہ مرتب ہو رہا ہے اس میں ہمارا تخلیقی حصہ بمنزلۂ صفر کے ہے۔ مثال کے طور پر یہ خیال کے دوسرے سیاروں پر انسانی زندگی کے امکانات سے اہل زمین کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا، انسانوں کے جنیٹک کوڈ کی دریافت کے بعد مستقبل میں عام فلاح کے لئے اسے کس طرح استعمال کیا جاسکے گا یا یہ کہ خلیوں کی تحقیق کے نتیجے میں اگر بڑھاپے کو روکنا یا شباب کو طول دینا ممکن ہو سکا تو اس سے ہماری معاشرتی زندگی پر کیا اثرات پڑیں گے یا یہ کہ ایک ایسی دنیا جہاں ہر ذی روح اپنے شناختی کوڈ یا مائیکرو چپ کے سبب بین المواصلاتی نظام کا قیدی بن کر رہ جائے گا، ایک ایسی دنیا کے طلوع کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں کسی فیصلہ کن موقف اختیار کرنے اور اس بارے میں

مناسب اقدام کرنے کا ہم مسلمان خود کو اہل نہیں پاتے۔ گویا موجودہ دنیا میں جو لوگ مستقبل کا منشور تیار کر رہے ہیں وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔

پھر یہ کیسا وعدہ ہے کہ ﴿ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ﴾۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اہل ایمان کو غلبہ اور تفوق کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جنہوں نے کفر کا ارتکاب کیا، جو خدا کے باغی ہوگئے، ان کے لئے آخرت میں تو دردناک عذاب ہے ہی دنیا میں بھی ان کا مقام بس یہ ہے کہ وہ صاغرون بن کر رہنے پر اکتفا کرلیں۔ اہل کفر کی دنیاوی زندگی تعذیب و تذلیل سے عبارت ہے۔ دین فطرت کے خلاف بغاوت انہیں ایک ایسے مقام پر پہونچا دیتی ہے کہ وہ کائنات میں جاری تخلیقی عمل سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ پالیسی امور میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ محض مادے کی سطح پر چوپاؤں کی طرح زندہ رہنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

کفر اور ایمان دراصل دو الگ الگ رویے ہیں۔ یہ کوئی ایسی شناخت نہیں جو قوموں کو پیدائشی طور پر ودیعت ہوتا ہو۔ انبیائے کرام نے جب بھی مردہ روحانی معاشرے میں زندگی کا صور پھونکا کفار و مشرکین کے معاشرے سے دیکھتے دیکھتے اہل ایمان کی ایک بڑی تعداد سامنے آگئی۔ پھر یہی لوگ جب قومی مسلمان بن گئے اور ان کی روحانی زندگی زوال پذیر ہوتی گئی تو ان ہی قوموں میں ایسے نفوس بھی پیدا ہوگئے جنہوں نے خدا سے بغاوت اور سرکشی کی نئی تاریخ رقم کی۔ افسوس کے اہل ایمان کے یہ طائفے جن میں بغاوت اور سرکشی کا ظہور ہوا، اس حقیقت کو نہ سمجھ پائے کہ کفر ہو یا اسلام اس کا انحصار زبانی دعویٰ پر نہیں بلکہ عمل پر ہے۔ خدائے واحد کی اطاعت شعاری پر کسی مخصوص قوم یا فرد کی اجارہ داری نہیں۔ قرآن مجید نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح اہل یہود مدت سے اس خیال میں گم ہیں کہ وہ اب بھی اپنے تمام فکر و عمل کے زوال کے باوجود تمام اقوام عالم پر فضیلت رکھتے ہیں۔

اہل یہود کی طرح ہم مسلمان بھی مدت سے کچھ اسی قسم کی خوش فہمی کے اسیر ہیں کہ اپنی تمام کج فکریوں کے باوجود آخر ساعت تک کے لئے دنیا کی سیادت ہمارے حصّے میں لکھ دی گئی ہے۔ البتہ عملی زندگی کے تلخ حقائق ہمیں خیر امت کی مختلف تشریح و تاویل پر مجبور کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، جیسا کہ ہمارے ایک کرم فرما نے پچھلے دنوں اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ خیر امت تو ہم ہی ہیں اور اقوام عالم کی سیادت پر فائز بھی ہمیں ہی کیا گیا ہے اب چاہے کوئی ہماری اقتدا کرے یا نہ کرے۔ کوئی کہتا ہے کہ غلبہ سے مراد سیاسی، معاشی یا تہذیبی غلبہ نہیں بلکہ عالم روحانیت میں اعلیٰ مقام کا حصول ہے اور یہ کہ کشف و مجاہدے کی دنیا میں ہم نے جو جھنڈے گاڑ رکھے ہیں کیا مجال کہ دوسری قومیں اس کے قریب بھی پھٹک سکیں۔ دوسری طرف اصحاب باطن ہیں جو گاہے بگاہے اس بات کی خبر دیتے رہتے ہیں کہ ابدال و اوتاد اور اقطاب کی مجلس میں جلد ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا جانے والا ہے جس سے

دنیا کی صورتحال میں حیرت انگیز تبدیلی آجائے گی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ تاویلیں ہمیں صورت حال کے صحیح ادراک سے روکنے میں مسلسل کامیاب رہی ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

سچ تو یہ کہ پچھلی کئی صدیوں سے، بلکہ ابو حامد الغزالی سے لے کر آج تک، مسلم ذہن مسلسل ایک مخمصے کا شکار ہے۔ اس سلسلے میں نئی دینیات کی تشکیل کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اس سوال کی دھار کو کم کرنے کے بجائے اس میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہیں۔ وہ لوگ جو خود کو اہل ایمان سمجھتے ہوں اور جنہیں اس بات پر مکمل یقین ہو کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے، خیر امت سے متصف، غلبہ و سیادت کی بشارت کے مستحق ہیں لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں وہ دوسروں کی اقتدا اور ان کے انحصار پر خود کو مجبور پاتے ہوں تو یقیناً وہ اپنے آپ کو ایک بڑے روحانی مخمصے میں مبتلا پائیں گے۔ گزشتہ دنوں ذات ختمی رسالت کے بارے میں کارٹون سازی کی جو مذموم حرکت کی گئی اور اس پر پوری مسلم دنیا کا جو زبردست ردعمل سامنے آیا اس نے بھی اس سوال کے صحیح جواب کی فراہمی میں ہماری زیادہ مدد نہیں کی۔ مراکش سے انڈونیشیا تک مظاہرین کے ٹھاٹھے مارتے سمندر نے ہمیں بظاہر تو یہی احساس دلایا کہ خدا اور اس کے رسول سے وابستگی میں اب بھی ہم مسلمانوں کا کوئی عشر عشیر بھی نہیں۔ البتہ ہمارے اہل فکر نے اس بات کی طرف توجہ کم ہی دی آیا یہ مظاہرے امت مسلمہ کے نظری موقف کا فی الواقع صحیح عکاس بھی ہیں یا نہیں۔

اصل صورت حال کا ادراک

بظاہر جن چیزوں کو ہم مظاہر ایمان سمجھ بیٹھے ہیں اور جن باتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں خدا اور اس کے رسول کے تئیں وابستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ذرا گہرائی سے تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ بدقسمتی سے دراصل ایسا ہے نہیں۔ مثال کے طور پر ایران اور شام میں کارٹون مخالف مظاہروں میں شدت اور اس کی آڑ میں بعض مغربی سفارت خانوں کو نشانہ بنانا دراصل مقامی حکومتوں کی سیاسی ضرورتوں کے تابع تھا۔ اسی طرح پاکستان میں اسلام پسند جماعتیں یہ سمجھ رہی تھیں کہ ناموس رسولؐ کے حوالے سے ان کے لئے اپنے سیاسی اہداف کے حصول کا سنہری موقع آپہونچا ہے۔ عالم عرب میں یوسف القرضاوی کی قیادت میں اخوانی اور سلفی گروہوں کا احتجاج بھی دراصل اسی خیال سے غذا حاصل کر رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں نصرت رسولؐ کے حوالے سے خطے میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی کے لئے راہ ہموار ہوسکتی ہے اور یہ کہ گیارہ ستمبر کے بعد سے اسلام پسند قوتیں جو مسلسل امریکی اور مقامی استبدادی حکومتوں کے نشانے پر رہی ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرسکتی ہیں۔ الہ آباد کے ایک بڑے اجتماع میں جو ناموس رسولؐ کے حوالے سے منعقد ہوا تھا اور جس سے مجھے بھی خطاب کرنے اور

جہاں عوامی جوش وجذبے کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا وہاں بھی ذاتِ ختمی رسالت سے محبت کے پس پردہ دوسرے عوامی اور سیاسی محرکات کہیں غالب تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ جو جلسہ ناموسِ رسولؐ کے حوالے سے بلایا گیا تھا اور جہاں علماء وقائدین، مشائخ ومتصوفین کی ایک بڑی تعداد جمع تھی اسے اپنے جوشِ خطابت میں اس بات کا خیال بھی نہ رہا کہ ظہر کا وقت کب آیا اور کب گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر واقع شہر کی جامع مسجد پر ویرانی چھائی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا کہ مسجد کے اردگرد دشمنانِ اسلام کے پتلے جلانے کا عمل جاری رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ فلک شگاف نعروں اور ہاؤ ہو کے ہنگاموں میں امت کی سمت کھوئی گئی۔ نہ تو عوام کو اپنے نظری منصب کا احساس رہا اور نہ ہی علماء وقائدین کو اس بات کی فکر کہ ہاؤ ہو کے یہ ہنگامے اور طرب خیزیاں متبعین محمدؐ کے شایانِ شان اور ان کی نظری تصویر کی عکاس بھی ہیں یا نہیں۔

جب عشقِ رسول کے نام پر بے ہنگم نعرہ بازیاں اور خالی خولی طرب خیزیاں قبولِ عام اختیار کرلیں تو عام انسانوں کے لئے صورتِ حال کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اولاً عوام ان ہنگامہ خیزیوں کو مقصودِ دین جانتے اور اس خیال سے مطمئن رہتے ہیں کہ ہماری حمیتِ ایمانی بدرجۂ اتم زندہ وتابندہ ہے۔ ثانیاً عوام کی زوال زدہ دینی حسّیت دنیادار حاملین اور سیاسی بازیگروں کو مسلسل اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ عوامی جذبات کے استحصال کے ذریعے دین کے حوالے سے اپنی مطلب براری کی تحریکیں چلاتے رہیں۔ اور چونکہ دین کے اس مسخ شدہ تصور میں ہنگامہ ہائے ہو سے اتنی زیادہ گرد اٹھتی ہے کہ صالح قیادت کے لئے اپنی بات کہنے اور عوامی غیظ وغضب کا سامنا کرنے کا امکان معدوم ہوجاتا ہے۔ گویا خدا اور اس کے رسول سے وابستگی کے نام پر گزشتہ چند صدیوں میں ہمارے درمیان جس طرح کی پرشور تحریکوں نے اپنے قدم جمائے ہیں اس نے بڑی حد تک صورتِ حال کے صحیح ادراک سے ہمیں روکے رکھا ہے۔ ہم جسے مظاہر ایمان سمجھ بیٹھے ہیں وہ نری جذباتیت ہے۔ خالی الدماغ لوگوں کا رویہ ہے۔ یہ ان کا رویہ نہیں جن کی فراست سے ڈرنے کی بات کہی گئی ہے۔ جب تک اہلِ ایمان اپنے اس رویہ میں بنیادی تبدیلی نہیں لاتے اور قرآن مجید کے صفحات میں سنجیدہ غور وفکر کے لئے آمادہ نہیں ہوتے انہیں اس سوال کا شافی جواب نہیں مل سکتا کہ آخر اہلِ ایمان غلبہ واستیلاء کی تمام قرآنی بشارتوں کے باوجود اس دنیا میں خود کو حاشیہ پر کیوں محسوس کرتے ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام محض زبانی ایمان کا قائل نہیں۔ مسلم متکلمین کے درمیان یہ بات ابتدائی صدیوں میں ہی بحث کا موضوع بن گئی تھی کہ صرف زبانی اقرار کو استناد حاصل ہوسکتا ہے یا عملی رویے سے بھی اس کی شہادت لازم سمجھی جائے گی۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا مطالبہ دراصل اسی بات پر دال ہے کہ مؤمنین صادقین کا ایمان ہمیشہ عمل سے اپنی تصدیق کرتا ہے اس کے برعکس منافقین اپنے قولی ایمان کا اپنے عمل سے مسلسل انکار کرتے رہتے ہیں۔ گویا جس ایمان کی پشت پر عمل کی قوت نہ ہو اسے قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جائے گا۔ ابتدائی عہد کے مسلمان جو ایمان کی

اس لذت سے آشنا تھے کائنات میں خود کو ایک کلیدی رول پر مامور پاتے تھے۔ انہیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ آخری ساعت تک دنیا میں جو کام بھی ہوگا اب متبعین محمدؐ کی حیثیت سے اس کی قیادت کا فریضہ انہیں انجام دینا ہے۔ تب خیر کا کام یا عمل صالح کا مفہوم ان تمام کاموں پر محیط تھا جس سے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود وابستہ تھی۔ قرآن نے محمد رسول اللہ کو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا تھا۔ پھر بھلا ان کے متبعین کے اعمال صالحہ سے عام دنیائے انسانیت کیوں کر متمتع نہ ہوتی۔

قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عمل صالح دراصل نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور اوراد و وظائف جیسی شخصی عبادتوں سے بہت آگے کی چیز ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات و اقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ لھم اجرھم عند ربھم ﴾ (بقرہ ۲۷۷)۔ نماز اور زکوٰۃ سے علیحدہ عمل صالح کا یہ مطالبہ جو قرآن اہل ایمان سے کرتا ہے اور جس حوالے سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس اجر موجود ہے، آخر ہے کیا؟ قرآن مجید نے مختلف اسالیب میں' ایسے اہل ایمان کو جو عمل صالح سے متصف ہیں' جنت کی بشارت دی ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ والذین آمنوا و عملوا الصالحات اولئك اصحاب الجنة ﴾ (بقرہ ۸۲) بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عمل صالح کے وہ حاملین بھی جن کا تعلق دوسرے ایمانی طائفوں سے ہے مثلاً یہود و نصاریٰ اور صابئین تو ایسے خداشناسوں اور فکر آخرت رکھنے والوں کو بھی عطائے ربی ﴿ اجرھم عند ربھم ﴾ اور ہر قسم کے خوف و حزن سے نجات ﴿ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ﴾ کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ گویا اہل ایمان' خواہ ان کا تعلق کسی بھی نبوی طائفے سے ہوا گروہ عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو دنیا و آخرت کی کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن کے اس عمومی کلیے کی روشنی میں اگر ہم قومی مسلمان اپنا غیر جانبدارانہ محاسبہ کر سکیں تو اس سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ غلبہ و استیلاء کی قرآنی بشارت سے آج ہم محروم کیوں ہیں؟

قرآن کی اصطلاح میں عمل صالح ان تمام کاموں کو محیط ہے جو خدا کے نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو اور جس کے نتیجے میں نوع انسانی کو عام فائدہ پہونچے۔ شاہراہ عام سے کانٹا ہٹانے اور اسے عام انسانوں کی سہولت کے لئے صاف رکھنے سے لے کر نوع انسانی کو رشد و ہدایت سے ہمکنار کرنا، انہیں توہمات و سرکشی سے نجات دلانا اور ان کے لئے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنا یہ سب کچھ عمل صالح کے دائرے میں آتا ہے۔ مؤمن جہاں عمل صالح یا مثبت خلاقانہ رویے سے معاشرے کی اصلاح و زیبائش میں لگا رہتا ہے وہیں کافر اپنے منفی رویے کی وجہ سے اس نظام عالم کو مسلسل زک پہونچانے کے فراق میں رہتا ہے۔ البتہ یہ کفار بھی اگر تائب ہو جائیں اور ایمان و عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو یہ بھی کامیابی کی

بشارتوں کے اتنے ہی حقدار ہوں گے۔ (قصص ۶۷)۔قرآن میں بعض مقامات پر عمل صالح کو کفر کی ضد بتایا گیا ہے ﴿من کفر فعلیه کفره و من عمل صالحا فلأنفسهم یمهدون ﴾ (الروم ۴۴) جو لوگ مثبت خلاقانہ رویے سے متصف نہیں ہوتے، جو نوع انسانی کے قافلے میں عمل صالح کا اپنا حصہ ڈالنے سے اجتناب کرتے اور جن کی نگاہیں اپنے ذاتی یا قومی فائدے سے آگے نہیں دیکھ پاتیں ایسی قومیں اپنے اس منفی رویے کی وجہ سے کفر کے بہت قریب آجاتی ہیں۔ خلاقانہ قوتوں کا آبشار اگر خشک ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم عمل صالح کی مخالف سمت میں گامزن ہیں۔ ایسی قومیں دنیا کی امامت کی اہل نہیں رہتیں۔ بندر صفتی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ دوسری قوموں کی نقل میں ہی وہ اپنی عافیت جانتی ہیں۔ جیسا کہ اہل یہود جیسی برگزیدہ قوم کے ساتھ ہوا ﴿کونوا قردة خاسئین﴾۔

اس وقت دنیا میں انسانی زندگی کو نئی سمت دینے، معیار زندگی کو بلند کرنے، خدا کی کائنات کی تسخیر، خشکی، سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش، رسل و رسائل کی سہولیات، سفر و حضر کی آسائشیں اور اس جیسے جتنے اعمال صالحہ بھی انجام پا رہے ہیں بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصہ اس میں خاصہ کم ہے۔ اس حقیقت سے شاید چشم پوشی مشکل ہو کہ موجودہ دور میں ہوائی سفر، ٹیلی فونی رابطے، ٹیلی ویژن، ریڈیو، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی ایجاد نے انسانی زندگی کو جس غلغلہ انگیز انقلاب سے دوچار کر دیا ہے اس کے نتیجے میں عام انسان کے لئے علوم و اطلاعات سے واقفیت حاصل کرنا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ antibiotics کی ایجاد اور طب کے میدان میں جدید تحقیق نے بندگان خدا کے لئے بہتر زندگی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ کتنے ہی بے لوث اہل فن، جن کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں، انہوں نے عمل صالح کی اس مہم جوئی میں اپنی زندگیاں دے ڈالیں۔ جب ہی یہ ممکن ہوا کہ آج ہم اکیسویں صدی کی ابتداء میں سائبر اسپیس کے شہری کی حیثیت سے حقیقی دنیا سے بھی پرے ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کی پوزیشن میں ہیں جو اطلاعات کے غیر مرئی تاروں کے علاوہ کہیں اور وجود نہیں رکھتی۔ عمل صالح کے اس عالمی مشن میں مشرق سے افرادی قوت گاہے بگاہے ضرور ملتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عمل میں قومی مسلمانوں کی شرکت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ گزشتہ تین سو سالوں میں اس علمی اور اکتشافی معرکے کی قیادت ہمارے ہاتھوں میں نہیں رہی ہے اور نہ ہی راسخ العقیدہ مذہبی فکر نے اس عمل کو عمل صالح سے تعبیر کیا ہے۔

مسلم مذہبی حلقوں میں ابو حامد غزالی کے عہد سے تصوف کے زیر اثر فکر و نظر کا جو زوال جاری رہا اس نے ہمیں یہ باور کرایا کہ کائنات میں غور و فکر اور اس کی تسخیر کا کام وقت کا زیاں ہے۔ ہم اہل ایمان کا کام تو یہ ہے کہ ہم خود کو اوراد و وظائف میں مشغول رکھیں کہ مجاہدے کے بجائے مکاشفے کا راستہ ہمیں مشاہدۂ حق کی منزل مقصود تک لے جا سکتا ہے۔ ہم نے دانستاً اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔ قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو ان

آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب وغریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور وفکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالے سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدارس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔ اسی طرح عمل صالح کے حوالے سے محیر العقول قسم کے اوراد ووظائف مسلم معاشرے میں رائج ہو گئے۔ کسی نے تسبیح ہزار دانے پر صبح وشام تمام کرنے کو عمل صالح قرار دیا تو کسی کو یہ غلط فہمی رہی کہ املی کے بیج پر سبحان اللہ وبحمدہ کا لکھوکھا ورد امت کی مشکل کشائی کے لئے مجرب ہے۔ ٹیکنالوجی کی مداخلت سے ایسے دستی آلے بھی اہل ایمان کے ہاتھوں میں دیکھے گئے جو وظائف کی گنتی الیکٹرونک طریقے سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کے لغو اور بے فائدہ عمل پر حضرت عمرؓ نے ابتدائی عہد میں ہی سخت تنبیہ کی تھی لیکن مختلف قسم کے علماء ومشائخ کے زیر اثر عمل صالح کے اس غیر قرآنی تصور نے ہماری راسخ العقیدہ فکر میں مسلسل اپنی جگہ بنائے رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں دوسری قوموں نے عمل صالح کے عالمی پروجیکٹ پر اپنا قائدانہ تفوق برقرار رکھا ان کی پیش قدمی مسلسل جاری رہی، وہیں ہم عمل صالح سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس عمل میں اپنی ذاتی حیثیت سے شریک بھی ہوئے انہیں یہ احساس ندامت مسلسل کچوکے لگاتا رہا کہ شاید کشف ومجاہدے اور اوراد ووظائف کی دنیا کو خیر باد کہہ کر انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ وہ اپنی آخرت کے سلسلے میں ایک طرح کے تذبذب کا شکار رہے اور شاید اس لئے کوئی بڑی کامیابی ان کے ہاتھ کم ہی آسکی۔

اعمال صالحہ کے سلسلے میں اس فکری مغالطے نے اگر ایک طرف تعقل پسند مسلمانوں کو سیکولرزم کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف مذہبی مسلمانوں کے لئے یہ مجبوری بن گئی کہ وہ ایک ایسی خیالی دنیا میں پناہ لیں جہاں تلخ حقائق ان کو پریشان نہ کرتے ہوں۔ زوال کی صدیوں میں صوفیانہ اسلام کی قبولیت' چلہ' گشت جیسی غیر اسلامی اصطلاحوں کا رواج اور کشف ومجاہدے پر زور دراصل اسی بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مسلمان اہل فکر اس سوال کا راست سامنا نہیں کرنا چاہتے کہ آخر اتنی بے شمار قرآنی بشارتوں کے باوجود آج ہم اہل ایمان کا حال اتنا پتلا کیوں ہے؟ حالانکہ اللہ کا صریح وعدہ ہے: ﴿وعداللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم﴾ (النور ۵۵)۔ غلبہ واستیلاء کا یہ قرآنی وعدہ اسی دنیا کے لئے ہے۔ اس لئے محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ مؤمنین عزت ووقار کے لئے ایک دوسری زندگی کا انتظار کریں۔ وہ انصاف پرور خدا جو ذرے ذرے کے حساب کا قائل ہو جو ہر اچھے اور برے کام پر اجر کا وعدہ کرتا ہو ﴿فمن یعمل مثقال ذرة خیر یره﴾ بھلا وہ اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اعمال صالحہ میں مشغول قومیں تو حاشیہ پر رہیں اور خیالی دنیا میں نیک عمل کے دعویدار اقوامِ عالم کی قیادت پر متمکن ہو جائیں۔